گذشتہ سے پیوستہ

(۲)

تحریر : علامہ محمد اسد
ترجمہ : محمد معین خان بی اے

اسلامی اور مغربی تہذیب کا بنیادی فرق

اسلامی ثقافت سے امنڈتی ہوئی تجدید شباب کی لہروں نے یورپ کے بہترین دماغوں کو ایک نئی قوت اور ایک نئی توانائی کے ساتھ کلیسا کے تباہ کن اقتدار سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس مقابلہ نے شروع شروع میں اصلاح دین کی تحریکوں کا روپ اختیار کیا جو یورپ کے مختلف ملکوں میں ایک ساتھ وجود میں آئی تھیں اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسیحی طریق فکر کو زندگی کے نئے تقاضوں کے ہم آہنگ بنایا جائے۔ یہ تحریکیں فی نفسہ صحت مند تھیں۔ اگر انہیں حقیقی روحانی کامیابی سے ہم کنار ہونے کا موقع مل جاتا تو یہ یورپ میں سائنس اور مذہب کے مابین کسی حد تک مفاہمت کرا دیتیں۔ لیکن چونکہ قرونِ وسطیٰ کے کلیسا کے ظلم و زیادتی نے یورپ کے قلب و دماغ پر ایسے گہرے گھاؤ لگائے تھے کہ محض اصلاح و تجدید دین سے ان کا اندمال ہونا ممکن نہ تھا۔ مزید برآں خود اصلاحِ دین کی تحریکیں بڑی سرعت کے ساتھ مفاد پرست گروہوں کی سیاسی جد و جہد کی صورت میں ذلیل و خوار ہو گئیں۔ مسیحیت صحیح معنی میں اصلاح پذیر ہونے کی بجائے پہلے مدافعانہ اور پھر رفتہ رفتہ متعذرانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ کلیسا ـــــ کیتھولک ہو کہ پروٹسٹنٹ ـــــ اپنی ذہنی بازی گریوں سے، ناقابل فہم عقیدوں سے تحقیر عالم کے جذبہ سے انسانیت کے مظلوم طبقات کے اتلاف حقوق کے معاملہ میں موجود الوقت حکومت کی ناعاقبت اندیشانہ تائید سے دست کش نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی ان بھاری ناکامیوں کی بے جا ویل کرنے اور اپنے کھوکھلے دعووں کے ذریعہ ان کی کچھ نہ کچھ توجیہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا یورپ پر مذہبی فلسفہ کی گرفت ضعیف سے ضعیف تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ اٹھارویں

صدی میں انقلاب فرانس اور دیگر ممالک میں اس انقلاب کے ثقافتی نتائج کی بلاخیز موجوں نے کلیسا کی کشتی اقتدار کے پرخچے اڑا دئے۔

اس وقت کے حالات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس مرتبہ بھی ایک نئی روحانی تہذیب کو جو متکلمانہ الٰہیات کی ستم شعارانہ ظلمتوں سے نجات حاصل کر چکی تھی، سرزمین یورپ میں پروان چڑھنے کا ایک اچھا خاصا موقع میسر آگیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں فلسفہ، آرٹ، ادب اور سائنس کی اقالیم میں یورپ کے بعض دماغ اور روحانی اعتبار سے بعض بے انتہا طاقتور شخصیتیں منظر شہود پر ابھر آئی تھیں۔ لیکن زندگی کا یہ روحانی تصور صرف چند افراد تک محدود رہا۔ یوروپی عوام ایک زمانہ دراز تک ایسے مذہبی عقائد کی قید و بند میں مبتلا رہنے کے بعد جن کا انسان کی فطری کوششوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ ان زنجیروں کے ایک دفعہ ٹوٹ جانے کے بعد مذہب، کے صحیح راستہ پر چل نکلتے

یورپ کے مذہبی احیاء کی راہ میں حائل ہونے والا سب سے بڑا عقلی عامل شاید وہ مروجہ تصور تھا جس کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام "ابن اللہ" قرار پاتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ فلسفیانہ ذہن رکھنے والے مسیحیوں نے ابنیت کے تصور کو اس کے اپنے حقیقی معنوں میں کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ وہ اس تصور سے پیکر انسانی میں رحمت باری کا ظہور مراد لیتے تھے، لیکن ہر شخص کا ذہن فلسفیانہ نہیں ہوا کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیوں کی بہت بڑی اکثریت "ابن" کے وہی معنی مراد لیتی تھی جو لغت میں پائے جاتے تھے۔ اگرچہ اس لفظ میں ایک قسم کی نسبیت کی چاشنی بھی موجود رہی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ میں ابن اللہ کے تصور نے لوگوں کو قدرتی طور پر عقیدۂ تجسیم کی راہ پر ڈال دیا جس کی رو سے اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک سفید لہراتی ہوئی داڑھی والے شفیق و مہربان بوڑھے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شکل جسے بیشمار اعلیٰ درجہ کی ماہرانہ تصویروں نے دوام بخش دیا تھا۔ اہل یورپ کے تحت شعور پر نقش کالحجر بن کر رہ گئی۔ جس زمانہ میں یورپ میں کلیسائی عقیدہ کے اقتدار کا سکہ رواں تھا۔ اس عجیب و غریب تصور کے خلاف آواز اٹھانے پر کوئی مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جوں ہی قرون وسطیٰ کی ذہنی بندشیں ایک دفعہ ٹوٹ گئیں تو ایک طرف یورپ کے مفکرین انسان نما خدا باپ کے تصور پر راضی نہ ہو سکے تو دوسری طرف تجسیم کا نظریہ خدا

کے مقبول عام تصور میں ایک مستقل عامل کی صورت اختیار کر گیا۔ جب روشن خیالی کو پھیلے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تو یوروپی مفکر طبعی طور پر کلیسائی تعلیم کے پیش کردہ تصوّر باری سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ حالانکہ یہی وہی واحد تصوّر تھا جس کے وہ کبھی عادی ہو چکے تھے۔ اب انہوں نے خود تصور باری اور اس کے ساتھ مذہب کو بھی مسترد کرنا شروع کر دیا۔

مزید برآں صنعتی ترقی نے بھی اپنی تمام عظیم الشان مادی ترقی کی سحر طرازیوں کے ساتھ لوگوں کو نئی نئی دلچسپیوں کیطرف راغب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح اس ترقی نے یورپ میں مذہبی خلاء پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس خلاء میں مغربی تہذیب کے فروغ نے ایک المناک پلٹا کھایا۔۔۔۔ المناک اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو مذہب کو حیات انسانی کی قوی ترین صداقت سمجھتا ہے۔ سابقہ کلیسائی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد جدید یوروپی ذہن نے متعینہ حدیں توڑ دیں۔ اور رفتہ رفتہ اپنے اطراف ہر قسم کے مقتضیات روحانی کے خلاف بغض وعناد کی خندقیں کھود لیں۔ اس تحت شعوری خوف کی بناء پر کہ مبادا روحانی اقتدار کی طاقتیں کہیں دوبارہ مسلط ہو جائیں۔ یورپ اصول وعمل میں ہر مذہب دشمن چیز کا مؤید و مددگار بن گیا۔ یعنی وہ اپنے قدیم رومی ورثہ کیطرف رجعت کر گیا۔

ان حالات کے مدنظر وہ شخص ہرگز مستوجب ملامت نہیں ہو سکتا جو یہ حجت پیش کرتا ہو کہ مغرب کو ان شاندار کامرانیوں سے ہم کنار ہونے کے قابل بنانے والی مسیحیت کی وہ "برتری" نہ تھی جو اسے دیگر ادیان پر حاصل تھی۔ اس لئے کہ اگر یورپ کی عقلی طاقتیں خود مسیحی کلیسا کے اصولوں کے خلاف اپنی تاریخی جدوجہد نہ جاری رکھی ہوتیں تو ان کامرانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یورپ کا موجودہ مادہ پرستانہ تصوّر دراصل مسیحی روحانیت سے یورپ کا انتقام ہے، جو زندگی کی فطری سچائیوں کی راہ سے بھٹک کر بہت دور جا پڑی تھی۔

ہم مسیحیت اور جدید مغربی تہذیب کے نجی تعلقات کی گہرائی میں نہیں جانا چاہتے۔ جدید مغربی تہذیب اپنے تصورات ومنہاجات میں مذہب کی اس قدر شدید مخالف کیوں ہے۔ اس کے متعلق ہم نے تین وجوہ بتلانے کی کوشش کی ہے جو غالباً سب سے بڑے وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ رومی تہذیب کا ورثہ اور حیات انسانی اور اسکی قدر ذاتی کے بارہ میں اس تہذیب کا انتہائی مادہ پرستانہ رویّہ ہے۔ دوسری وجہ مسیحی تحقیر دنیا اور انسان کی

فطری خواہشوں اور اسکی جائز کوششوں کو دبانے کے خلاف فطرت انسانی کی بغاوت ہے (اس پر مستزاد سیاسی و معاشی ارباب لیست وکشاد کے ساتھ کلیسا کی روایتی رفاقت اور ارباب اقتدار کی ہر اس تجویز کی دیدہ دانستہ تائید ہے جو استحصال ناجائز کے لئے وضع کی جاتی تھی۔) اور تیسری وجہ اللہ تعالیٰ کا تجسیمی تصوّر ہے۔ مذہب کے خلاف یہ بڑی کامیاب بغاوت تھی ــــ اس قدر کامیاب کہ مسیحیت کے مختلف فرقے اپنے بعض عقائد کو یورپ کے بدلتے ہوئے سماجی اور ذہنی احوال سے ہم آہنگ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اپنے متبعین کی سماجی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کرنے اور اس کو خاص اپنی سمت پھیرنے کے بجائے جیساکہ ہر مذہب کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ مسیحیت نے ایک مرعوب قسم کی ریت رسم کی وضع اختیار کر لی اور ایک سیاسی مہم جوئی کی عبا پہن لی۔ عوام الناس کے نزدیک مسیحیت صرف ایک رسمی معنی رکھتی ہے۔ بعینہٖ جیسے قدیم رومیوں کے دیوتاؤں کا معاملہ تھا۔ جنہیں نہ سماج پر کوئی حقیقی اثر ترتیب کرنے کی اجازت تھی اور نہ ان سے اس تبدیلی کی کوئی توقع ہی کی جا سکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب میں اب بھی بعض ایسے افراد موجود ہیں جو مذہبی انداز میں سوچتے ہیں اور مذہبی انداز میں محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح سے ہم آہنگ کرنے کی جان توڑ کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت استثنائی ہے۔ اوسط درجہ کا مغربی خواہ وہ جمہوریت پسند ہو کہ آمریت پسند، سرمایہ دار ہو کہ بالشویکی، جسمانی محنت کرنے والا ہو کہ دماغی ــــ صرف ایک ہی ایجابی "مذہب" جانتا ہے، اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ زندگی کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ حیات دنیاوی کو زیادہ سے زیادہ آسودہ یا مروجہ محاورہ کے مطابق "فطرت سے بے نیاز" بنایا جاتے۔ دیو پیکر فیکٹریاں، سینمائیں، کیمیاوی تجربہ خانے، ناچ گھر، پن بجلی کارخانے اس مذہب کی عبادت گاہیں ہیں اور بنکار، انجنیئر، فلمی ستارے، ملوں کے مالک اس مذہب کے پروہت و پیشوا ہیں۔ اس آرزوئے اقتدار و انبساط کا ناگزیر نتیجہ سرتاپا مسلح مخالف گروہوں کا وجود ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں ان گروہوں کے مفادات باہم متصادم ہوتے ہیں۔ تو وہ ایک دوسرے کو ہلاکت دنیا ہی کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس کا ثقافتی نتیجہ ایک ایسی ہیئت انسانی کی تخلیق ہے جس کا اخلاقی نظام صرف عملی افادیت تک محدود ہوتا ہے اور جس کا عظیم ترین معیار خیر و شر مادی کامیابی ہے۔

اس وقت مغرب کی سماجی زندگی جس زبردست قلب ماہیت میں سے گذر رہی ہے۔ اس میں یہ نیا افادیت پسندانہ نظام اخلاق روز افزوں عیاں ہوتا چلا جارہا ہے۔ وہ تمام محاسن واوصاف جو معاشرہ کی مادی فلاح سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں مثلاً فنی کارکردگی، جذبۂ حب وطنی، قوم پرستانہ گروہ بندی، ان کی خوب مدح سرائی کی جاتی ہے۔ اور ان کی قدر کے بارے میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دئے جاتے ہیں۔ درآنحالیکہ ایسے محاسن و اوصاف جو حال حال تک خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل قدر تھے مثلاً فرزندانہ محبت، سعادت مندی یا جنسی وفا شعاری، وہ سب بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اپنی اہمیت کھوتے چلے جارہے ہیں۔ اس لئے کہ ان سے معاشرہ کو کوئی محسوس قسم کا مادی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس دور کا خاتمہ کیا جارہا ہے جس میں مضبوط خاندانی رشتے گروہ یا قبیلہ کی فلاح وبہبود کے لئے قطعی طور پر ناگزیر سمجھے جاتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ایسے دور کے خدوخال گاڑھے جارہے ہیں جس میں مجموعی تنظیم (COLLECTIVE ORGANISATION) وسیع تر عنوانات کے تحت زور پکڑتی جارہی ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جو بنیادی طور پر حرفیاتی (TECHNOLOGICAL) ہے اور جسے خالص میکانیاتی (MECHANICAL) خطوط پر بے انتہا سرعت کے ساتھ منظم کیا جارہا ہے، باپ کے ساتھ بیٹے کا برتاؤ اس وقت تک کسی بڑی سماجی اہمیت کا مسئلہ نہیں بنتا جب تک کہ باپ بیٹے اپنے باہمی برتاؤ میں شائستگی کے ان عام حدود کو ملحوظ رکھتے ہیں جو معاشرہ نے اپنے اراکین کے میل جول اور راہ ورسم پر عائد کر رکھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی باپ کا اپنے بیٹے پر سے حق واختیار روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ اور منطقی اعتبار سے بیٹے کے دل میں باپ کی عزت وتعظیم گھٹتی جارہی ہے۔ باپ بیٹوں کے باہمی تعلقات آہستہ آہستہ ختم کئے جارہے ہیں۔ اور ان تعلقات کو ہر قسم کے عملی اغراض کے لئے، ایک ایسے مشینی معاشرہ کے مسلمات کا لعدم بناتے جارہے ہیں جس کا رجحان یہ ہے کہ ایک فرد کے دوسرے فرد پر جو حقوق ہوتے ہیں اور — اس تصور کے منطقی ارتقاء کے مطابق — وہ حقوق بھی جو خاندانی رشتہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ان سب کو یک قلم موقوف کر دیا جائے۔

اس کے پہلو بہ پہلو "قدیم" جنسی اخلاق کا بھی تدریجی طور پر خاتمہ ہوتا جارہا ہے۔ مغرب جدید میں جنسی وفا شعاری اور انضباط بہت تیزی کے ساتھ قصۂ ماضی بنتے

جارہے ہیں کیونکہ یہ زیادہ تر اخلاقیات پر موسس ہیں اور اخلاقی ملحوظات معاشرہ کی مادی فلاح و بہبود پر کوئی محسوس اور فوری قسم کا اثر مرتب نہیں کرتے۔ اس طرح جنسی تعلقات میں ضبط و انضباط کا عنصر بھی بڑی تیزی کے ساتھ اپنی اہمیت کھوتا جارہا ہے اور اسکی جگہ ایک ایسا نیا نظام اخلاق اپنے قدم جمارہا ہے جو جسم انسانی کی بے قید و بند انفرادی آزادی کا اعلان کرتا ہے، مستقبل میں جنسی پابندی صرف وہی ہوگی جو ولادت و اموات کے اعداد و شمار اور اصلاح نسل کے ملحوظات کے مدنظر عائد کی جاسکے گی۔

یہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مذہب دشمن ارتقاد جس کا سطور بالا میں ایک مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سوویٹ روس میں کسطرح اپنے منطقی کمال کو پہنچ گیا ہے۔ سوویٹ روس کا ثقافتی فروغ مابقی مغربی دنیا کے ثقافتی فروغ سے بنیادی طور پر ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹوں کا تجربہ جدید مغربی تہذیب کے قطعی مذہب دشمن اور روحانیت دشمن رجحانات کے کمال اور ان کی بجا آوری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موجودہ سرمایہ دار مغرب اور کمیونزم کے مابین جو شدید قسم کا غار پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ مختلف رفتاریں ہوں جن سے یہ متوازی تحریکیں جو اصلاً ایک ہیں اپنی مشترک منزل کیطرف بڑھتی جارہی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تحریکوں کی باطنی مشابہت مستقبل میں زیادہ سے زیادہ آشکارا ہوتی چلی جائیگی۔ لیکن اس وقت بھی یہ مشابہت مغربی سرمایہ داریت اور کمیونزم دونوں کے اس بنیادی میلان میں اجاگر پائی جاتی ہے کہ انسان کی روحانی انفرادیت اور اخلاقیات کو ایک اجتماعی مشنری کے مادی تقاضوں کے آگے جھکا دیا جائے جسے معاشرہ کہتے ہیں جس میں فرد کی حیثیت پہیہ میں ایک دندانہ دار چکر کے سوا کچھ نہیں۔

ان تمام واقعات سے ہم صرف یہی ایک نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اس قسم کی تہذیب ہر اس ثقافت کے حق میں زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے، جسکی بنیادیں مذہبی اقدار پر قائم ہوں۔ اب ہم اپنے ابتدائی سوال کیطرف رجوع ہوتے ہیں کہ کیا اسلامی طریق فکر و حیات کو مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق بنا دیا جائے، اس کا جواب قطعی طور پر نفی میں دیا جانا چاہیئے۔ اسلام کا سب سے مقدم اور نمایاں مقصد انسان کی اخلاقی ترقی ہے۔ لہذا اس مذہب میں اخلاقی ملحوظات خالص افادیت پسندانہ ملحوظات کو کالعدم کر دیتے ہیں۔ جدید مغربی تہذیب میں

صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مادی افادیت کے ملحوظات انسان کی تمام سرگرمیوں پر حاوی اور غالب ہیں۔ یہاں اخلاقیات زندگی کے تیرہ و تار پس منظر میں دھکیل دیئے گئے ہیں۔ اور انہیں اس حد تک خوار و زبوں کر دیا گیا ہے کہ ان کی حیثیت محض ایک نظریاتی وجود کی سی رہ گئی ہے جسے قومی زندگی پر رتی برابر بھی اثر مترتب کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ایسے ماحول میں اخلاقیات کی باتیں کرنا مکاری و منافقت سے کچھ کم نہیں۔ جدید مغربی مفکروں میں جو لوگ پاکیزہ فہم و ذکا کے مالک ہیں۔ ان کے نظریات صرف اس صورت میں قابل جواز قرار دیئے جاتے ہیں جبکہ وہ مغربی تہذیب کے معاشرتی مقدرات کے متعلق اپنے قائم کردہ قیاسات میں ماورائی اخلاقیات کو راہ پانے نہ دیں۔ اور جہاں تک ان سے کم درجہ کے مفکروں نیز ان لوگوں کا تعلق ہے جو اپنے اخلاقی رویّہ کے بارہ میں کوئی واضح اور قطعی نظریہ نہیں رکھتے، ان کے پاس ماورائی اخلاقیات کا تصوّر فکر کے محض ایک غیر عقلی عامل کی حیثیت سے زندہ و باقی ہے۔ بعینہٖ جیسے ماہر ریاضیات بعض "اصم" اعداد سے کام چلانے پر مجبور ہو جاتا ہے جو فی نفسہٖ کسی بیّن مقدار کی نمائندگی تو نہیں کرتے تاہم تخیل کے ان رخنوں کی بل بندی کے لئے درکار ہوتے ہیں جو ذہن انسانی کی ساخت کی تحدیدات ——— (STRUCTURAL LIMITATIONS OF HUMAN MIND) ——— کی بنا پر پیدا ہو جاتے ہیں۔

اخلاقیات کے بارہ میں اس قسم کے حیلہ جویانہ رویّہ کا مذہبیت کے ساتھ قطعاً کوئی میل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغرب کے اخلاقی اصل اصول کا بھی اسلام کے ساتھ کوئی میل نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلمانوں کو علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) اور علوم اطلاقیہ (APPLIED SCIENCES) کی اقلیم میں مغرب سے تھوڑی بہت تشویق و تحریک حاصل کرنے سے بھی باز رکھا جائے۔ مگر یاد رہے کہ مغرب کے ساتھ ثقافت کا رشتہ صرف اسی نقطہ پر جوڑا جائے گا اور اسی نقطہ پر وہ ختم بھی کر دیا جائے گا۔ اس سے آگے بڑھنے، مغربی تہذیب کی ہو بہو نقل کرنے، اس کے طریق حیات پر گامزن ہونے اسکی معاشرتی تنظیم کو اپنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خود اسلام جیسے عملی مذہب اور دینی ہیئت سیاسیہ کے وجود پر تباہ کن ضرب لگ جائے گی۔ ■■